انقلابی شاعر نعیم صدیقی

عطاء الحق قاسمی

زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے آپ کا رابطہ اپنی عملی زندگی کے ابتدائی برسوں میں پڑتا ہے اور آپ ان کے لیے اپنے دل میں ایک مقناطیسی کشش محسوس کرتے ہیں۔ یہ آپ کے محلے کا کوئی بزرگ بھی ہوسکتا ہے۔ اسکول کے زمانے کا کوئی استاد بھی ہوسکتا ہے اور کوئی رائٹر بھی جس سے آپ بہت متاثر ہوئے ہوں۔ اس زمانے میں یہ لوگ کچھ مافوق الفطرت قسم کی مخلوق محسوس ہوتے ہیں لیکن جب آپ شعور کی کچھ اور منزلیں طے کر لیتے ہیں تو اس بات کا امکان موجود ہوتا ہے کہ آپ ان کے دائرۂ اثر سے بالکل نکل جائیں بلکہ آپ کو اپنے اس ''دور جاہلیت'' پر ہنسی آئے یا یہ کہ اب وہ آپ کے لیے مافوق الفطرت تو نہ رہیں لیکن ان کی قدر و قیمت آپ کے دل میں سلامت رہے۔ صورت حال جو بھی ہو ان میں سے کوئی بھی، جسے آپ طویل عرصے کے بعد اپنے سامنے پاتے ہیں تو آپ اپنے اندر ایک فطری گرم جوشی محسوس کرتے ہیں۔ میں اس تجربے سے کئی بار گذرا ہوں!

مگر گذشتہ ماہ جب میں نے ایک طویل عرصے کے بعد نعیم صدیقی کو ہسپتال کے ایک کمرے میں ڈاکٹروں کے جھرمٹ میں دیکھا تو مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا، دبلے پتلے نعیم صدیقی نحیف و نزار بھی لگ رہے تھے۔ میرے سامنے وہ شخص تھا جس کی ساری عمر طاغوت کے خلاف جنگ کرتے بسر ہوئی تھی۔ جو مردانہ وار جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کے خلاف لڑتا رہا۔ جو حکومتوں سے نبرد آزما رہا اور اس پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جس نے برداشت کیں مگر اس کے پائے استقلال میں رتی بھر لغزش نہیں آئی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ بستر علالت پر پڑے اس نحیف و نزار شخص کے عزم میں کوئی کمی

نہیں آئی۔اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو یقین کے چراغوں سے مماثل ہوتی ہے اور جو مردوں کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتا ہے!

میں نے نعیم صدیقی کو دیکھا تو میں چالیس پنتالیس سال پیچھے چلا گیا اس دور میں جب میں ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں آٹھویں کا طالب علم تھا۔ایک روز صبح دعا کے اجتماع میں ہم سے ایک کلاس سینئیر طالب علم نے (جوان دنوں معروف افسانہ نگار ہیں) اپنی ایک نظم سنائی جس کا ایک مصرعہ ''اے نیل کی موجو نہ کرو خون ہمارا'' تھا۔اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ اس طالب علم کی اس کاوش پر بہت حیران ہوئے کیونکہ جو نظم اس نے سنائی تھی، وہ کسی اسکول کے طالب علم کی بجائے کسی بہت منجھے ہوئے شاعر کی نظم لگتی تھی چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب اور اساتذہ نے اس کو بہت شاباش دی۔دعا کے بعد میں اور ناصر زیدی اپنے اس سینئر اسکول فیلو کے پاس گئے اور نظم کی بہت تعریف کی۔اس پر ہمارے اس سنئیر دوست نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور مشفقانہ انداز میں کہا کہ آپ لوگ میرے پاس آیا کریں ان شاء اللہ آپ بہت کچھ سیکھیں گے اور یہ کہ علم اور قابلیت مومن کی میراث ہے جہاں سے ملے حاصل کر لینا چاہیے، وغیرہ۔مگر اس راز پر سے پردہ تو یونیورسٹی کے زمانے میں جا کر کھلا کہ جس نظم پر موصوف سارے اسکول کی داد سمیٹتے رہے۔وہ ان کی نہیں۔نعیم صدیقی کی تھی! اور یہ نظم اپنے نام سے انہوں نے غالبًا اس لئے سنائی کہ علم اور قابلیت مومن کی میراث ہے۔ جہاں سے ملے حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں!

یہ نعیم صدیقی سے میری پہلی ملاقات تھی، ان سے دوسری ملاقات، ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ میں مولانا مودودیؒ کی اقامت گاہ پر ہوئی۔ یہ ایوب خاں کا زمانہ تھا۔ جماعت اسلامی کے مرکزی رہنماؤں کی جیل سے رہائی کے بعد ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔نعیم صدیقی مولانا مودودیؒ کے ساتھ بیٹھے تھے اور میں چلتے چلتے ان کے برابر میں آن کھڑا ہوا تھا۔پنجابی کے شاعر عبداللہ شاکر اپنی ایک طنزیہ نظم سنا رہے تھے۔جس کے ایک شعر کا مفہوم تھا کہ حکومت کھیر بنانا چاہتی تھی، مگر دلیہ

بن گیا۔نعیم صاحب نے مولانا کو مخاطب کر کے پوچھا مولانا آپ کو پنجابی آتی ہے؟ مولانا نے کہا ''پنجابی آتی ہو یا نہ آتی ہو، مگر مولوی ہوں، کھیر خوب سمجھتا ہوں'' اس پر نعیم صدیقی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس وقت تو ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا مگر اب سوچتا ہوں کہ نعیم صاحب نے مولانا سے یہ سوال کیوں پوچھا کیونکہ یہ سوال تو خود نعیم صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ''محترم نعیم صدیقی صاحب، کیا آپ کو پنجابی آتی ہے؟'' نعیم صاحب سے یہ سوال پوچھنے کا جواز یہ ہے کہ نعیم صاحب ٹھیٹھ پنجابی ہیں مگر اپنے پنجابی دوستوں سے بھی اردو ہی میں بات کرتے ہیں۔ میں ان سے مختلف ملاقاتوں میں متواتر پنجابی بولتا رہا ہوں لیکن وہ جواب میں اردو کی مار مارتے رہے ہیں۔ میں ایک پنجابی سے پنجابی ہی میں گفتگو کا خواہاں دو وجوہ کی بناء پر ہوں، ایک تو یہ کہ ہر انسان پر اپنی مادری زبان کا بھی حق ہے جو کہ اسے ملنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ بہت کم پنجابی اردو میں بات کرتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، ان کے لہجے کی پنجابیت صوتی جمالیات سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتی اور یوں مجھے الجھن لگتی ہے۔ بہر حال پنجاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ سے لے کر جناب نعیم صدیقی تک پنجابیوں کی ایک پوری لڑی ہے جنھوں نے اردو کی محبت میں اپنی مادری زبان اور اس کے حقوق بھی نظر انداز کر دئے۔ مگر الطاف بھائی ہیں کہ پنجاب اور پنجابیوں کو گالی دینے سے باز بھی نہیں آتے:-

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

خیر یہ بات تو یونہی درمیان میں آ گئی میں تو آپ کو یہ بتانے جا رہا تھا کہ میرا بچپن جوانی اور ادھیڑ عمری، سب دینی ماحول میں بسر ہوئی ہے۔ ہمارے دینی گھرانے میں جو لٹریچر آتا تھا اس پر بھی مذہب کی چھاپ ہوتی تھی، چنانچہ نعیم صدیقی کو میں نے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمیؒ کی لائبریری کو کھنگالتے ہوئے دریافت کیا میں نے جب پہلی دفعہ ان کی نظم ''ہم لوگ اقراری مجرم ہیں'' پڑھی تو میں ان کا عاشق ہو گیا، میری رگوں میں احراری خون ہے اور یہ انقلاب کے نام پہ ہلارے لینے لگتا ہے۔ نعیم صدیقی صاحب کی یہ نظم ان کی ساری شاعری کی طرح خوفناک قسم کی انقلابی نظم تھی جس میں طاغوتی

طاقتوں کو للکارا گیا تھا، پھر میں نے نعیم صدیقی کی ساری شاعری پڑھ ڈالی، ان میں سے وہی شاعری مجھے زیادہ اچھی لگی جو انہوں نے مختلف ادوار میں جیل میں کی تھی اور جس میں ایک انقلابی آہنگ تھا، ان کی غزلیہ شاعری بھی یقیناً اچھی ہے لیکن ایک دین دار انسان کی غزل میں جو محبوبہ ہوتی ہے وہ اس کی بیوی ہی ہوتی ہے اور اپنی بیوی کو سامنے بٹھا کر جو غزل کہی جائے وہ بہت اچھی بھی ہو تو کتنی اچھی ہو سکتی ہے؟ تاہم انکی غزلیہ شاعری کے اس حصے میں بہت گداز پایا جاتا ہے جو انہوں نے جیل میں کی۔ مگر یہاں بھی وہ اپنے مجازی محبوب کو یاد کرتے کرتے اپنے حقیقی محبوب اسلام اور پاکستان کی طرف آجاتے ہیں جس کی خاطر انہوں ن عیش و آرام کی زندگی کی بجائے کانٹوں بھری زندگی کا انتخاب کیا۔

بات جب نعیم صدیقی کی ہو رہی ہو تو وہ ان کی شاعری تک محدود نہیں رہ سکتی چنانچہ نعیم صدیقی کے تذکرے کے بعد مولانا نعیم صدیقی کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ مولانا نعیم صدیقی مولانا مودودیؒ کے بعد جماعت اسلامی کے سب سے بڑے فکری رہنما ہیں "محسن انسانیت ؐ" ان کی عظیم الشان تصنیف ہے، اگر آپ حضورؐ کی سیرت کا مطالعہ روایتی انداز سے ہٹ کر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت اعلی ادبی زبان کا چسکا لینا چاہتے ہیں تو "محسن انسانیت" ضرور پڑھیں۔ مولانا کی غیر روایتی انداز میں لکھی ہوئی دوسری تصانیف بھی اپنے اندر زبان و بیان کا چٹخارہ رکھتی ہیں اور یوں میری نظروں میں نعیم صدیقی صرف اعلی پائے کے انقلابی شاعر ہی نہیں، بلکہ اعلی پائے کے نثر نگار بھی ہیں، ان کی شاعری اور ان کی نثر ایک نظریئے کے تابع ہے یہ ترقی پسند ادیب بھی ایک نظریئے کے تابع ہو کر لکھتے تھے۔ مگر ان کو بڑا ادیب اور بڑا شاعر تسلیم کیا گیا، نعیم صدیقی کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے پاس ڈھنڈورچیوں کی فوج ظفر موج نہیں ہے ورنہ انہیں بھی "حصہ بقدر جثہ" ضرور ملتا۔ ترقی پسندوں میں صرف ایک بدقسمت شاعر ہے جسے خود ترقی پسندوں نے نظر انداز کیا، اس کا نام ساحر لدھیانوی ہے۔ اس کی انقلابی سوچ آج بھی مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے مگر اسے شاید اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ وہ سچا ترقی پسند تھا۔ حبیب جالب کا شعر ہے:-

دنیا کا جن کو درد ہے محدود ے چند ہیں
باقی تمام اپنی ترقی پسند ہیں

سو اپنی ترقی پسند کرنے والوں نے اپنی ترقی کی طرف توجہ دی اور ساحر لدھیانوی ایسے دردمند شاعر کو نظر انداز کر دیا۔ میں نظریئے میں خلوص، دردمندی اور کومٹ منٹ کا عاشق ہوں۔ میرے نزدیک شاعر یا ادیب قابل احترام ہے جو کسی نظریئے پر یقین رکھتا ہو اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دے سکتا ہو۔ حریت پسند، حریت پسند ہی ہوتا ہے خواہ وہ نیلسن منڈیلا ہو اور خواہ سید علی گیلانی ہو خواہ وہ ساحر لدھیانوی ہو۔ اور خواہ وہ نعیم صدیقی ہو اور یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ ہم ان میں سے کسی کو محض اس کے نظریئے سے اختلاف کی بناء پر نظر انداز کر دیں۔

یہ ظلم میرے ممدوح، میرے اندر شعر و ادب کے ذریعے انقلاب کی چنگاری روشن کرنے والے بڑے شاعر اور بڑے نثر نگار نعیم صدیقی کے ساتھ بھی ہوا ہے اور اس ظلم میں ترقی پسندوں کے ساتھ خود اسلام پسند دانشور بھی شریک ہیں جنہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان پر جماعت اسلامی کی چھاپ نہ لگ جائے!

❁❁❁